بالکل بھیگ جاتا ہے۔ اس قدر شرابور کہ آرام سے بیٹھنے کی کوئی جگہ باقی نہیں رہتی۔ یہی کیفیت پہاڑوں میں جا کر ہوتی ہے۔ کیسا بھی اچھا ساتھ کیوں نہ ہو انسان تنہا رہ جاتا ہے اور اُداسی کی دُھند اسے چاروں طرف سے لپیٹ لیتی ہے۔ اندر آہستہ آہستہ اندھیرا چھانے لگتا ہے اور باہر کیسی بھی دُھوپ کیوں نہ کھلی ہو، کیسی بھی ٹھنڈی ہوا کیوں نہ چل رہی ہو اندر ٹپاٹپ بوندیں گرنے لگتی ہیں اور شدید بارش ہو جاتی ہے اور اندر سے بجھا ہوا انسان باہر کے آدمیوں کے کام کا نہیں رہتا۔ ان کا ساتھی نہیں رہتا۔ یہی حالت عمر کی تھی!

اخروٹ کے تناور درخت تلے، ٹھنڈی ہوا میں ہم نے گرم چائے پی اور کسی نے کسی سے بات نہ کی کھلے ہوئے مناظر میں ہم کچی برف کے قاش بن کر گھل گئے تھے اور اس ٹھنڈی ہوا میں تحلیل ہو گئے تھے جس میں چیڑ کی خوشبو، گھاس کی مہک اور دریا کی باس شامل تھی۔ شیر باز اپنی سلیٹی رنگ کی چادر سے چپلیاں جھاڑتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہوٹل کا ایک لڑکا تھا جو چائے کے برتن لینے آیا تھا۔ شیر باز کے آواز دینے سے پہلے ہی ہم اپنی جگہ سے اُٹھے اور جیپ کی طرف چل دیے۔ یہاں سے ناران کوئی بارہ میل کے فاصلے پر تھا اور راستے میں ہمیں ایک بہت بڑے گلیشیئر پر سے گزرنا تھا۔ جیپ میں بیٹھتے ہی ہم پر سے اُداسی کے بادل چھٹ گئے اور پٹرول کی بُو اور ترپال کی گندہ ہمیں پھر اس دُنیا میں واپس لے آئی۔ پہاڑ کا ایک تیکھا موڑ کاٹنے کے بعد مسعود نے ہم سب کی توجہ ٹین کی چھتوں والی ایک بستی کی طرف کرائی اور بولا:

"یہ کوئی فیکٹری معلوم ہوتی ہے۔"

"فیکٹری یہاں کہاں؟" عماد نے کہا: "یہاں تو بس یا گھاس یا بکریاں یا خودرو سبزہ ہے یا پتھر۔ فیکٹری کا یہاں کیا کام!"

"فیکٹری ہے۔" عمر نے کہا۔

"بالکل فیکٹری ہے۔" مفتی نے اعتماد کے ساتھ کہا: "کاٹیج انڈسٹری سے کوئی بڑی چیز۔"

میں نے بھی اپنے علم کے زور پر کہا:

"فیکٹری ہی معلوم ہوتی ہے۔"

اس وقت شیر باز اپنے خیالوں میں گم جیپ چلا رہا تھا۔ اُس نے ہماری بحث میں حصّہ نہیں لیا۔ شاید اس نے ہماری باتیں سُنی نہیں، ورنہ وہ ضرور دخل دیتا۔ جب ہم اس علاقے کے قریب سے گزرے، تو وہ ایک اچھا سا گاؤں تھا اور اُس کے درمیان سیڈن کے گھر تھے۔ عمّاد نے سر اُونچا کر کے کہا:

"اوئے گدھو! یہ فیکٹری ہے؟"

ہم سب اپنی اپنی جگہ کھسیانے ہو گئے۔ اعظمی نے جیپ کا پردہ ذرا سا اُوپر اُٹھا کر کہا:

"فیکٹری ہی ہے۔ فیکٹری نہیں تو اور کیا ہے؟"

"یہ گاؤں ہے گدھے!" عمّاد نے جل کر کہا۔

"وہی تو میں کہہ رہا ہوں۔" اعظمی نے کہا۔ "بچّے بنانے کی فیکٹری ہے۔"

ہماری ہنسی مسعود اور مُفتی کے قہقہے میں دب کر رہ گئی۔

عُمر نے کہا:

"یار مُفتی! یہ بچّے بنانے کی نئی ترکیب پر تو میں حیران رہ گیا۔ خُدا کی قسم مجھے نہیں علم تھا کہ مچھلیاں اس طرح سے بچّے پیدا کرتی ہیں۔"

"لو بھائی صاحب ابھی تک وہیں گھوم رہے ہیں۔" عمّاد نے زور کا قہقہہ لگایا۔ "پہلے ہم شاہ جی سے تنگ تھے کہ وہ اپنا لاہور ساتھ اُٹھائے پھرتے ہیں۔ اب یہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔"

کاغان سے پہلے راستے میں (مجھے جگہ کا نام یاد نہیں رہا) ہم نے گورنمنٹ ہیچری دیکھی تھی۔ یہاں سیمنٹ کے چھوٹے چھوٹے چوبچّوں میں ٹراؤٹ مچھلی کی پونگ تیار کی جا رہی تھی۔ ایک تالاب میں لاروے تھے۔ دُوسرے میں ایک ایک آدھ آدھ انچ چھوٹی مچھلی۔ اس سے اگلے میں انگلی بھر لمبی مچھلیاں، دو تالابوں میں سیاہ اور رین بو ٹراؤٹ کے نر اور مادہ مچھلیاں۔ صحت مند جوان مست مچھلیاں۔ جوانی میں اندھے نروئے مچھلے۔ ہم سب نے زندگی میں پہلی مرتبہ ٹراؤٹ مچھلی کی شکل دیکھی۔ مسعود اس سے پہلے یہ مچھلی کھا چکا تھا۔ لیکن اسے اس کی شباہت کا علم نہ تھا۔ ہیچری کا نگران ایک بڑی عمر کا پٹھان تھا جس

کے ہاتھ بڑے بڑے، چہرہ کرخت اور ڈاڑھی کڑبڑی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں محبت اور اس کے ہاتھ ملانے کے انداز میں شفقت تھی۔

عمر نے کہا:

"خان صاحب! یہ مچھلیاں یہیں بچے دیتی ہیں؟"

"بچے نہیں جی، انڈے دیتی ہیں" خان نے جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے انڈے یہیں دیتی ہیں تالابوں میں؟"

"دیتی نہیں جی" خان بولا "ان سے انڈے دلواتے ہیں، پھر ان سے بچے نکالتے ہیں، پھر ان کو تالابوں میں منتقل کرتے ہیں۔ بڑا مشکل کام ہے صیب! لیکن خدا کا فضل ساتھ ہو تو ہر کام ہو جاتا ہے۔"

ہم میں سے کوئی بھی اس کی بات نہ سمجھا، اس نے ہمارے سوالیہ چہرے دیکھے، تو ہاتھ کے اشارے سے بولا:

"اندر آؤ صیب! کوارٹر میں۔ آپ کو ٹراؤٹ کے انڈے دکھائیں۔"

ہم اس کے ساتھ اندر کوٹھڑی میں چلے گئے۔ اس نے ایک ماہر ٹورسٹ گائیڈ کی طرح کہنا شروع کیا:

"یہ تو آپ کو معلوم ہے صیب کہ مچھلی اور مچھلا دوسرے جانوروں کی طرح کبھی کراس نہیں کرتے۔"

"بالکل ٹھیک!" مفتی نے اثبات میں سر ہلایا، تو ہم سب اس کے پیچھے پڑ گئے کہ یار پہلے ہمیں تو سمجھ لینے دے۔"

خان نے کہا:

"دریا میں جب مچھلی انڈے دیتی ہے تو اپنی پوری مستی اور جوانی پر آ کر دیتی ہے۔ انڈے دینے سے پہلے اس کو بڑے بڑے صحت مند اور تگڑے نر چاروں طرف سے گھیرے رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے۔ بس نر مچھلے مچھلی سے ایک ایک گز ایک ایک فٹ کے پاس گھومتے رہتے ہیں۔"

"وہی نر۔" عمّاد نے پُوچھا۔

"نہ جی، بدلتے رہتے ہیں۔ کوئی اس مچھلی کے گرد گھومتے رہے، کوئی دُوسری مچھلی کے گرد جاکر گھومنے لگے۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوتا ہے صیب کہ مچھلی پتھروں کے اندر، یہ جو چھوٹے چھوٹے پتھر ہوتے ہیں ناں کنکریوں جیسے، ان میں اپنی پُوچھل مار مار کر ایک ٹوپا سا بنا لیتی ہے اور اس میں انڈے دیتی ہے۔ کوئی آٹھ دس ہزار کے قریب۔"

"کیا؟ کتنے؟" عُمر نے چیخ کر کہا۔

"یہی صیب کوئی دس ہزار کے قریب اور پھر اُدھر سے بھاگ جاتی ہے۔ اپنے مزے سے تیرتی ہے۔ کوئی اُوپر نکل گئی۔ کوئی دو میل نیچے چلی گئی۔"

"انڈے دے کر چلی گئی؟" اعظمی نے کہا۔

"ہاں جی!"

"اور پھر نہیں آتی؟"

"نہ جی، پھر اس کو آکر کیا لینا ہے؟ بس اپنا کام کیا اور ختم۔"

"پھر ان میں سے بچے کتنے دن بعد نکلتے ہیں؟" مسعُود نے پُوچھا۔

"ابھی ٹھہرو صیب! ابھی بچے کدھر سے نکلیں گے؟ ابھی تو خالی ہوائی انڈے ہیں۔ ان سے بچے کس طرح سے نکل سکتے ہیں؟" خان نے قدرے خفگی کے ساتھ کہا۔ "ابھی تو مچھلا آئے گا۔"

"اچھا! ابھی موصوف کو تشریف لانا ہے۔" اعظمی نے کہا۔ "لیکن اب کیا فائدہ؟"

وقت پر قطرہ بہت ہے ابرِ خوش ہنگام کا
جل گیا جب کھیت تب برسا تو پھر کس کام کا

"نہ جی، ابھی تو اس کو برسنا ہے۔" خان نے کہا۔ "جب مچھلی انڈے دے کر چلی گئی ناں صیب، تو مست مچھلا ادھر آیا، ان انڈوں کے ساتھ اپنا بدن ملایا۔ اس کے بعد بس اللہ کی حکمت ہے صیب! اس نے اپنا خاص مادہ ان انڈوں پر پھیلا دیا۔"

"ہیں؟" عُمر نے چیخ کر کہا۔

"ہاں صیب، بس وہ مادہ سارے انڈوں پر پھیل گیا اور مچھلا چلا گیا۔۔۔ اس کے بعد

جی" خان بولا۔ "دیا کا تیز پانی اس مادے کو انڈوں پر سے دھو دیتا ہے۔ زیادہ دیر نہیں ٹھہرتا مادہ۔ بس پانچ سات منٹ میں انڈے گھل جاتے ہیں"

"وہ کیوں؟" عماد نے پوچھا۔

"بڑا زبردست مادہ ہوتا ہے حبیب! تیزابی۔ پانچ منٹ سے پہلے پہلے انڈوں کی باریک جھلی میں اتر جاتا ہے۔ زیادہ دیر پڑا رہے، تو سارے کے سارے انڈے سڑ جائیں، تباہ ہو جائیں"

"مچھلی مچھلے کی ملاقات نہیں ہوتی خان؟" عمر نے پوچھا۔

"ناں جی۔ اس کو کیا پتہ کون سی مچھلی کے انڈے ہیں اور مچھلی کو کیا پتہ کہ کون مچھلا انڈوں پر اپنا مادہ ڈال گیا۔ یہ دیکھئے یہ ہمارا ٹرے ہے۔ اس میں ہم انڈے لیتے ہیں"

لکڑی کا کوئی ڈیڑھ فٹ لمبا، ایک فٹ چوڑا اور تین انچ لمبا ڈبا تھا۔ اس کے چاروں طرف مچھر جالی لگی تھی۔ ڈھکنے کے فریم میں بھی یہی جالی تھی، صرف پیندا لکڑی کا تھا۔ ایسے دو تین ٹرے دیوار کے ساتھ لٹک رہے تھے اور ان سے مچھلی کی بساند آ رہی تھی۔

خان نے کہا:

"ہم انڈوں پر آئی ہوئی مچھلی تالاب سے پکڑتے ہیں اور اس کے پیٹ پر سیدھے ہاتھ کی دو انگلیوں کا دباؤ ڈال کر سارے انڈے اس ٹرے میں دلوا لیتے ہیں"

"ٹھہرو، ٹھہرو۔ ایک منٹ، ایک منٹ" عمر نے بے چین ہو کر کہا۔ "آپ مچھلی تالاب سے باہر نکال لیتے ہیں کھلی ہوا میں؟"

"ہاں جی بالکل کھلی ہوا میں، لیکن ہم تالاب کے کنارے بیٹھ کر یہ عمل کرتے ہیں، اتنی جلدی مچھلی مرتی نہیں صیب۔ پھر صیب یہ ٹرے سارا انڈوں سے بھر جاتا ہے"

"تیزی سے گرتے ہیں انڈے؟" مسعود نے پوچھا۔

"بالکل فس کلاس۔ بڑی تیزی کے ساتھ" خان نے جواب دیا۔

"جب یہ ٹرے انڈوں سے بھر جاتا ہے۔ تو پھر ہم ایک مچھلا تالاب سے نکالتے ہیں اور

اس کی پُوچھل ان انڈوں پر کر کے اس کے سر سے پوچھل کی طرف دو اُنگلیوں کا دباؤ اسی طرح ڈال کر نیچے تک جاتے ہیں۔"

اس نے بتایا کہ ہم مچھلے کا سر اپنی ٹھوڑی اور ہنسلی کی ہڈی کے درمیان دبا لیتے ہیں۔ بائیں ہاتھ سے اس کا بدن پکڑتے ہیں اور سیدھے ہاتھ کی دو اُنگلیوں کا دباؤ اس کے پھسلتے پیٹ پر ڈالتے ہوئے نیچے کی طرف جاتے ہیں۔ مطلوبہ مادے کی ایک پچکاری چلتی ہے اور بڑے میں رکھے ہوئے سارے انڈے لتھڑ جاتے ہیں۔

جب خان یہ بات بتا رہا تھا، تو اُس کی ٹھوڑی اس کے سینے سے لگی ہوئی تھی اور وہ ہنگری کا ایک بوڑھا وائلینسٹ لگ رہا تھا جو اپنی جوانی کے زمانے میں بڑے بڑے اوپرا میں وائلن بجاتا رہا ہو۔ ہم سب خاموشی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کوٹھڑی میں سناٹا تھا اور وہ ابھی تک اپنے خیالی مچھلے کو اسی طرح گلے لگائے کھڑا تھا، حالانکہ سارے انڈے کبھی کے لتھڑ چکے تھے۔

"پھر صیب ہم مچھلے کو واپس چونچے میں چھوڑ کر پانچ سات منٹ تک اس مادے کو انڈوں پر رہنے دیتے ہیں۔ اس کے فوراً بعد یہ بڑے گیارہ نمبر چونچے میں ڈال دیتے ہیں جہاں دریا کا ٹھنڈا پانی ایک طرف سے داخل ہو کر دوسری طرف سے نکل رہا ہے۔ پانی جالی میں سے گزر کر سارا مادہ دھو دیتا ہے اور انڈے بچے پیدا کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔"

اعظمی نے کہا:

"سمجھ گئے مسعود یہ ہے اصل فیکٹری بچے پیدا کرنے کی۔"

عمر نے چڑ کر کہا:

"یار تم بیچ میں بکواس نہ کیا کرو... اچھا خان صاحب پھر؟"

"پھر کیا جی۔ پھر جب ان سے لاروا نکل آتا ہے تو اس کو نمبر ایک چونچے میں سے نکال کر نمبر دو میں ڈال دیتے ہیں۔ پھر آگے۔ پھر آگے۔ بس اس طرح سے کام چلتا رہتا ہے۔ اللہ کی حکمت ہے صیب۔"

شیر باز نے جیپ روک کر کہا:

"کلمہ پڑھو یارا ہم گلیشیر پر سے گزرنے لگے ہیں۔"

ہم سب اپنے اپنے خیال سے چونکے۔ میں نے جیپ سے اترنے کی کوشش کی، لیکن اس خیال سے چپکا بیٹھا رہا کہ ساتھی بزدل کہیں گے۔ اپنی بزدلی کو چھپانے کے لیے انسان کو بڑے رنگ بدلنے پڑتے ہیں۔ ان سب میں سے بڑا اور آخری رنگ وہ ہے جب آدمی خوف کے مارے مستقل طور پر بہادر بن جاتا ہے اور بہادری کے کارنامے سرانجام دے کر اس جہان سے چلا جاتا ہے۔

ٹھنڈی ہوا کا ایک طوفان سا اٹھا۔ ہمارے کپڑے اڑنے لگے۔ جیپ گلیشیر پر سے غاؤں غاؤں کرتی گزر رہی تھی۔ میں نے پڑھا تھا کہ گلیشیر جہاں سے سیاہ رنگ کا ہو اس پر نہیں جانا چاہیے۔ جیپ جہاں چل رہی تھی وہ برف بالکل سفید تھی۔ میرے چہرے پر خوف کے آثار دیکھ کر عماد نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا اور کہا:

"شاہ جی! یہ گلیشیر نہیں، یہ تو پہاڑوں کے درمیان جمی ہوئی برف کے تودے ہیں جو پھسل کر سڑک پر آ گئے ہیں۔"

میں نے نگاہیں اوپر اٹھا کر دیکھا، اونچے پہاڑ کی کومل کومل رانوں کے درمیان سفید برف جمی ہوئی تھی اور دور دور تک زندگی کے کوئی آثار دکھائی نہ دیتے تھے۔ میں نے کہا:

"مفتی جی، یہ پہاڑ کس قدر فریجڈ ہے؟"

"نہ نہ نہ!" عماد نے تڑپ کر کہا۔ "گلیشیر اور گلیشیر کا علاقہ فریجڈ نہیں ہوتا، بڑا سخت اور رائیل ہوتا ہے۔ برف جب بھی پہاڑوں پر پڑتی ہے پگھل جاتی ہے یا کم ہو جاتی ہے لیکن گلیشیر کبھی ختم نہیں ہوتے۔ تمہیں پتہ نہیں کہ ایک گلیشیر دن میں چھ انچ سے لے کر ایک فٹ تک پھسلتا ہے۔"

عماد نے کہا:

"مفتی جی! میں بھی گلیشیالوجی کے بارے میں کوئی زیادہ علم نہیں رکھتا۔ میرا مطالعہ بھی عام ڈائجسٹوں تک محدود ہے، لیکن یہ ہے حقیقت اور سائنٹیفک بات کہ جب تک برف کے

دو وسیع اور عریض تودے نہ ملیں، برف کی تحلیل کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور جب یہ دو مل جائیں، تو ان میں ابدیت آجاتی ہے۔ پاکستان کا سیاچن گلیشئر کوئی چون میل لمبا ہے اور یوں سمجھ لیجیے کہ مشرقی قراقرم سے لے کر وسطی قراقرم تک چلا جاتا ہے۔ اسی طرح ہس پار اور بیافو کے گلیشئر ہیں۔"

مُفتی نے کہا:

"اور یہ کب سے ہیں؟"

"ان کی عمر کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔" عمّاد نے کہا۔ "جب سے قراقرم کا یہ سلسلہ موجود ہے۔ ہزاروں، لاکھوں بلکہ اس سے بھی زیادہ سال گزر چکے ہوں گے تو اور مادہ برف ایک دُوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے لیٹے ہیں اور ہزاروں آدمی یہاں سے نروان حاصل کر چکے ہیں۔"

عُمر نے کہا:

"یار مُفتی! مَیں نہیں کہتا تھا، پہاڑ عظیم ہوتے ہیں، عاشق ہوتے ہیں، مُحب ہوتے ہیں، محبوب ہوتے ہیں، تم لوگ میری بات نہیں مانتے تھے۔"

"یار تیری بات تو ہم پچھلے چودہ برس سے مان رہے ہیں۔" عمّاد نے ہنس کر کہا۔

شیر باز ہماری اس گفتگو سے بالکل کٹ کر اب جیپ چلا رہا تھا اور اس کی نگاہیں سامنے سڑک پر تھیں۔ ایک مرتبہ اُس نے کچھ بتانے کی کوشش بھی کی، لیکن ہم نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ وہ چار سدہ کا رہنے والا تھا اور ہم کو سیاسی گفتگو میں اُلجھانا چاہتا تھا۔ لیکن اب ہم اس کی گرفت اور سطح سے بہت دُور نکل گئے تھے۔ اس کے ساتھ جو محبت اور یگانگت سفر کے شروع میں پیدا ہوئی تھی وہ اب کم ہوتی جا رہی تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ ہماری منزل قریب آ رہی تھی اور منزل قریب آجانے پر مسافر ایک دُوسرے سے اور ساربان سے دُور ہونے لگتے ہیں۔ منزل بھی کیا محبوب ہے کہ جب قریب آجاتی ہے، تو محبت کرنے والے ایک دُوسرے کے رقیب بن جاتے ہیں۔

میں نے رقیبوں کو محبت کی آگ میں جلتے اور بھسم ہوتے دیکھا ہے۔ پھر ان کی راکھ کو کئی کئی دن اور کئی کئی مہینے ویرانوں میں اُڑتے دیکھا ہے۔ ان لوگوں سے بھی ملا ہوں جو محبت کی آگ میں سُلگتے رہتے ہیں اور جن پر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ راکھ کی ہلکی سی تہہ چڑھ جاتی ہے، پھر اور وقت گزرنے پر دُور پار سے ہوا کا کوئی جھونکا گزرتا ہے، تو ان کی یہ راکھ جھڑ جاتی ہے اور انگارے پھر دہکنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی میری زندگی سے گزرے ہیں جو چُپ چاپ محبت کے سمندر میں اُتر گئے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ وہ لوگ بھی ہیں جو کاروبار کرتے ہیں، دفتروں میں بیٹھتے ہیں، دریا روکتے ہیں، ڈیم بناتے ہیں، ٹینک چلاتے ہیں اور محبت کی ایک بند ڈبیا ہر وقت اپنے سینے کے اندر محفوظ رکھتے ہیں۔ مسافر، سیاح، کوہ پیما، دشت نورد آپ کسی کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ قاہرہ کے ایئرپورٹ پر جو اٹالین اپنا بریف کیس گود میں ڈال کر بیٹھا تھا، سیاسیات کا ایک معمّر پروفیسر تھا جو ٹوکیو یونیورسٹی میں لیکچر دینے جا رہا تھا۔ اس کے عمر رسیدہ دل پر اس چھریرے بدن کی لڑکی کا بوجھ تھا جو حال ہی میں تھیسس اس کی نگرانی میں مکمل کر کے فارغ ہوئی تھی اور جس کا منگیتر اسے ہر روز یونیورسٹی سے لینے آتا تھا اور وہ سکوٹر پر اس کے پیچھے اس کے شانے سے گال لگا کر بیٹھتی تھی۔ ان دونوں کے روانہ ہونے سے پہلے پروفیسر ہمیشہ اپنے کمرے کی کھڑکی پر پردہ کھینچ دیا کرتا تھا۔

دراصل محبت کے لیے ایک خاص فضا، ایک خاص علاقے، ایک مخصوص ECOLOGY کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے دو دلوں کی یاد، دو دلوں کے ملنے کی احتیاج نہیں ہوتی، ایک خاص پس منظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ دراصل پس منظر بھی مناسب لفظ نہیں۔ یہ تو آدمی کی سوچ محدود کر دیتا ہے۔ اس کے لیے ایک اور چیز کی ضرورت ہوتی ہے جس کا ابھی تک نام تجویز نہیں کیا جا سکا۔ الفاظ بھی کیا بڑھئی کے اوزار ہیں کہ خیال کو چھیل چھال کر کاٹ کر رندہ سا لگا دیتے ہیں۔ اور اس کا قد گھٹا دیتے ہیں۔ ہم بھی کیا لوگ ہیں کہ ان بونوں کے سہارے تصوّر کی فصیلوں پر یلغار کرتے ہیں اور اپنے جانے قلعے فتح کر لیتے ہیں۔

آپ نے سبزی منڈی دیکھی ہوگی جہاں سبزی کی خرید و فروخت کا کاروبار ہوتا ہے۔ باہر سے رہڑے اور گڈیں اور ٹرک بھر بھر کر سبزی آتی ہے۔ کھلے صحن میں انبار لگ جاتے ہیں۔ تاجر، آڑھتی، کسان، زمیندار، کنجڑے ان انباروں کے اردگرد گھومتے رہتے ہیں۔ سہ پہر تک یہ انبار نہیں رہتے۔ سارے صحن میں گوبھی کے بڑے بڑے پتے، موٹے موٹے ڈنٹھل پژمردہ ساگ اور پیاز کے چھلکے پھیل جاتے ہیں۔ گندھ بھی ہوتا ہے۔ بُو بھی، لیکن تازگی بھی ہوتی ہے اور کلوروفل کی خوشبو بھی، پھر یہاں پھندر گائیں، گابھن بکریاں اور اصیل مُرغیاں آجاتی ہیں پتے سمٹنے لگتے ہیں۔ ڈنٹھل ختم ہونے لگتے ہیں۔ بیج چُگے جاتے ہیں۔ کچھ پیٹ بھرنے کی، کچھ شکر کرنے کی، کچھ اُبکائی کرنے کی کیفیت ہوتی ہے، لیکن باسی اور تازہ سبزے کی خوشبو ضرور باقی رہتی ہے۔ یہی حال ہیرا منڈی کا ہے۔ یہاں بھی باسی، تازہ، سڑی ہوئی اور پژمردہ محبت کی بُو باقی رہتی ہے۔ ان کوٹھوں پر چونکہ محبت کا کاروبار ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں آنے والا ہر شخص محبت کی لو میں ڈوبا ہوتا ہے۔ وہ چاہے اپنی بند ڈبیا اپنے ساتھ لائے یا اس جگہ کا ڈنٹھل اُٹھا کر مُنہ میں ڈال لے، اُسے ڈبیا کھولنی ہوتی ہے اور ڈنٹھل کا نمکین پانی چکھنا ہوتا ہے! ان گندے گندے کمروں میں، موٹے موٹے گدّوں، میلے کچیلے قالینوں اور دیواروں پر لگے پیلے پیلے آئینوں پر محبت کی تہیں جمی ہوتی ہیں۔ محبت کا جھول ہوتا ہے، محبت کی باس ہوتی ہے۔ یہاں کی عبادت میں لاکھ کوشش کے باوجود اور کوئی خیال ذہن میں نہیں آتا۔ کوئی اور بھگوان اس مندر میں نہیں اُترتا۔

جب میں ٹیلیویژن کے ایک پروگرام کے سلسلے میں پہلی بار یہاں گیا، تو تنگ و تاریک چوبارے کی کھڑکی سے ذرا پرے ہٹ کر قالین کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔ بڑی بی آئیں اور اپنے مخصوص انداز میں بولیں:

"ہائے شاہ جی آپ ادھر بیٹھیں کُرسی پر"

مَیں نے مہاتما بُدھ کی طرح ہلکا سا ہاتھ اُٹھا کر کہا:

"جی نہیں، مَیں یہاں بالکل ٹھیک ہُوں"

پھر مَیں نے اپنے آنے کی غرض بیان کی اور ہم پروگرام کے بارے میں باتیں کرنے

لگے۔ تھوڑی دیر بعد اندر سے بھرے بھرے بدن کی ایک لڑکی نمودار ہوئی۔ اُس کے ہاتھ میں کوکا کولا کی آدھی پی ہوئی بوتل تھی۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھی۔ ایک تکیہ اُٹھایا اور میرے پاس آکر بولی:

"یہ لے لیں"

مَیں نے چُپ چاپ وہ تکیہ لے کر اپنے زانو تلے دبا لیا اور میری آنکھوں کے سامنے وہ تمام لڑکیاں گھوم گئیں جنہوں نے میری زندگی میں اپنے اپنے مقام پر مجھے تکیے دیے تھے۔ عورت کی محبت کا سب سے بڑا مظہر مرد کو تکیہ دینا ہے۔ وہ کیسے بھی آرام سے کیوں نہ بیٹھا ہو، عورت اُسے سہارا ضرور دے گی، چاہے وہ سہارا کتنا ہی وقتی کیوں نہ ہو، چاہے وہ عورت کیسی بھی کاروباری کیوں نہ ہو۔ چاہے وہ قیام کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو۔ طوائف ہو یا ایئر ہوسٹس تکیہ ضرور پیش کرے گی۔

مَیں جتنی دیر وہاں رہا میرے ذہن میں محبتوں کی یادیں اُبھرتی رہیں۔ اپنی محبتیں، دوستوں کی محبتیں، قصے کہانیوں کی محبتیں اور میرے ذہن کی سبزی منڈی میں دُور دُور تک ڈنٹھل ہی ڈنٹھل پھیل گئے۔

جب میں اس چوبارے سے اُتر کر ایک دُوسرے گھر کی ڈیوڑھی میں پہنچا، تو اچانک میری نظریں چھت پر مرکوز ہو گئیں۔ بدبُودار ڈیوڑھی کی دھونسی ہُوئی چھت سے پرندوں کے پروں کا ایک دبیز گدا چمٹا ہُوا تھا۔ اس گدے میں جابجا آڑے ترچھے گول گول سوراخ تھے جو کافی گہرے دکھائی دیتے تھے۔ مَیں نے اس سے پہلے ایسی کوئی چھت نہ دیکھی تھی جو بالوں پر کے قالین سے مزین کی گئی ہو۔ اس قالین سے کچھ بال اور کچھ نرم نرم روئیں چھوٹ کر زمین پر بھی گری ہوئی تھیں۔ مَیں نے زمین سے کچھ بال اُٹھائے یہ جنگلی کبوتر کے پوٹے کے بال تھے اور ان کی چمک مدھم پڑ گئی تھی۔ ان کے ساتھ گوند کی ایک مروڑی بھی تھی اور اس میں سے سیخ کباب کی دُھلی ہُوئی سیخ کی مدھم سی خوشبو آ رہی تھی۔ مَیں نے سر اُٹھا کر ایک مرتبہ پھر چھت کو غور سے دیکھا اور ایک موٹا سا آدمی سارنگی پیٹ کے ساتھ لگائے سیڑھیوں سے اُترا، مجھے دیکھتے ہی اس نے گزا اُوپر اُٹھا کر دُعائیں دینا شروع کر دیں:

"دَولا بادشاہ، سائیں بادشاہ، چنگ بھاگ ساوے۔ بھلے لوک، کرم نواز"

مَیں نے ایک مستعد طالب علم کی طرح حیرانی سے پُوچھا:

"یہ چھت پر کیا ہے ؟"

"یہ گھونسلے ہیں بادشاہ ... ابابیلوں کے گھونسلے ۔"

"ابابیلوں کے گھونسلے ! یہاں ؟"

"جی بادشاہ ! یہ قسمت والا گھر ہے ۔ دو سال سے ابابیل ادھر رہتے ہیں ۔ بڑے انڈے بچے دیتے ہیں ۔ بڑے سُریلے لوگ ہیں ۔"

مَیں نے کہا :

"اب بھی رہتے ہیں ؟"

"کیوں نہیں جی ! اللہ فضل کرے !" اس نے سارنگی سینے سے دبا کر کہا ۔ "اب بھی رہتے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے انشاء اللہ ۔"

"مَیں نے ان کے گھونسلے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے ۔ بڑے عجیب ہیں ، کیسے بناتے ہیں ؟"

اس نے سنجیدگی سے جواب دیا :

"بادشاہ ! یہ جنوروں ، پرندوں کے پَر جمع کرتے ہیں ، پھر کسی سُریلے مکان کی چھت میں اپنے لعاب سے ان پروں کو چپکاتے ہیں ، چاروں طرف سے اور ایک کونے میں سوراخ چھوڑتے ہیں داخل ہونے کے لیے اور پھر اس کے اندر رہتے ہیں ۔ پروں کی تھیلی کے اندر یہیں انڈے بچے دیتے ہیں ۔"

مَیں نے کہا :

"کمال کاریگر لوگ ہیں ۔"

"کاریگر ! میرے بادشاہ !" ... اس نے محبت کے ساتھ کہا : "بڑے سُریلے ، بڑے کن رس جانور ہیں ۔ بڑے گنی ۔ اللہ نے ان کو بڑے مراتبے دیے ہیں ۔ جہاں پورے سُر لگتے ہوں وہاں اپنے گھونسلے بناتے ہیں ، جہاں بے سُرے لوگ رہتے ہوں وہاں سے ڈیرہ اُٹھا لیتے ہیں ۔"

مَیں نے کہا :

"مَیں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

وہ میرے قریب آکر رازدارانہ لہجے میں بولا:

"ابابیل کو میرے نبیؐ میرے سوہنے حضرت داؤدؑ کی دُعا ہے۔ وہ سُر میں اُڑتے ہیں، سُر میں تیرتے ہیں اور جہاں سُر ہوں وہاں گھر بناتے ہیں۔ اس گھر پر خُدا کی بڑی رحمتیں ہیں۔ دونوں بیبیاں ایسے سُر میں گاتی ہیں کہ جگنو روشنی چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں، جل بُجھ جل بُجھ نہیں کر سکتے ... ایسے ہی گھر میں ابابیلوں کے گھونسلے ہوتے ہیں۔"

"تو یہاں کسی اور گھر میں ان کے گھونسلے نہیں؟" مَیں نے پوچھا۔

"ہیں" اس نے ایمانداری سے کہا ... "بی بی ممتاز کے گھر میں ہیں اور کہیں نہیں۔"

"اور کہیں کیوں نہیں؟" مَیں نے پُوچھا۔

"اور کہیں سُر ہو میرے بادشاہ، تو ابابیل گھر بنائیں۔ ٹکا دھم ٹکا دھم والے کوٹھوں پر ابابیلوں کا کیا کام؟"

پھر مجھے خاموش دیکھ کر اُس نے خُود ہی کہنا شروع کیا:

"آج سے دو سال پہلے بی بی نجما ور کی ڈیوڑھی میں بڑے گھونسلے تھے ابابیلوں کے۔ شام کو ان کی واپسی پر ایک ہنگامہ ہوتا تھا۔ بی بی نے دو نئے روشندان کھلوائے تھے دیواروں میں ان کے آنے جانے کے لیے۔ بڑے خُوش تھے میرے بادشاہ جانور اس گھر میں۔"

"کیوں؟" مَیں نے پُوچھا۔

"تینوں بیبیاں بڑے بڑے سُر میں تھیں میرے بادشاہ۔ دو کو ذات پاک نے وہ گلے دیے تھے کہ بڑے بڑے بیچی راگ ان کے گلے سے نکل کر ان کے پاؤں پڑ جاتے تھے اور تیسری کو میرے مولا کی ذات نے پیر دیے تھے کہ ٹھیکے پر رکت ہوتی تھی۔ دھمک نہیں ہوتی تھی اور اس کے پیروں کے نیچے کا فرش ابابیلوں کے گھونسلے کی چھت تھی۔ وہ ایسے سُر اور بیٹ کو چھوڑ کر کہاں جا سکتے تھے۔"

"لیکن آپ ہی تو کہتے ہیں کہ وہ اب گھونسلے نہیں رہے۔" مَیں نے کہا۔

"بڑی نے ملتان کے ایک رئیس سے نکاح کر لیا۔ درمیانی نے نیلا تھوتھا کھا کر خودکشی کر لی اور تیسری فلموں میں چلی گئی۔ اب ہوٹل کے سیٹ پر ویمپ بن کر ناچتی ہے۔ میرے بادشاہ! اب ابابیل اس گھر میں کیسے رہ سکتے ہیں!"

میں نے ہنس کر کہا:

"تو یہ ابابیل آپ کی راجدھانی میں ہی گھونسلے بناتے ہیں اور کہیں نہیں؟"

"ناں ناں ناں..." اس نے گز والے ہاتھ سے کان کو چھوا اور ادب کے ساتھ بولا: "مسجدوں میں بھی گھونسلے بناتے ہیں میرے بادشاہ! لیکن ان مسجدوں میں جہاں کوئی سُریلا مؤذن ہو۔ میرے مولا حضرت بلالؓ جیسا، جہاں مین کنستر کھڑکتے ہوں، وہاں نہیں بناتے۔"

دراصل تعلّقِ خاطر کے لیے ایک خاص قسم کے ماحول، ایک خاص قسم کی فضا اور خاص نوعیت کے پس منظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن سارے الفاظ پھر میری سوچ کو محدود کیے دیتے ہیں۔ محبت کے لیے کچھ ایسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اس کے لیے شاید ابھی کوئی لفظ بنا نہیں۔ پہاڑوں پر بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ یہ ان کی ٹھنڈک، ان کے سبزے، ان کی عظمت، ان کی دُھند اور بارشوں کی وجہ سے نہیں ہوتا یا شاید انہی کی وجہ سے ہوتا ہو یہاں اگر کبھی انسان محبت میں شرابور ہو جاتا ہے۔ بلا وجہ۔ بغیر کسی ارادے یا مقصد کے۔ بنا دیکھے بھالے۔ بغیر کسی پلان کے۔

شیر باز نے کہا:

"صیب! جب ہم یہ موڑ مڑیں گے تو آپ کو ناران کا یوتھ ہاسٹل نظر آئے گا۔ بڑے ہپی لوگ ٹھہرتے ہیں یہاں آ کر۔"

"ہپی کون؟" مسعود نے پوچھا۔

"یہ جی اپنے ہپی نہیں ہوتے۔ انگریز لوگ۔ اپنا بستر مستر کمر پہ باندھ کر لاتے ہیں۔ بڑے خدائی خوش ہوتے ہیں۔"

"لیکن کرتے کیا ہیں خان؟"... عمّاد نے پوچھا۔

"خُدا خبر کیا کرتے ہیں یار اجی۔ چرس مرس پیتے ہیں۔ ملا گُلا کرتے ہیں... پیدل چلتے ہیں۔"

"بدمعاشی نہیں کرتے؟" عُمر نے پوچھا۔

"پتہ نہیں جی کرتے ہوں گے۔ بدمعاشی کرنے کو کون سا زیادہ ٹیم چاہیے۔ وہ دیکھو جی وہ" شیر باز نے کہا... "وہ ٹین کی چھت نظر آ رہی ہے ناں۔ وہی یُوتھ ہاسٹل ہے۔"

ہم سب نے گردنیں موڑ کر دیکھا۔ اُونچی پہاڑی کی گود میں پتھر کی دیواروں اور ٹین کی چھت والا یوتھ ہاسٹل بادل کے ایک ٹکڑے تلے شرمندہ سا کھڑا تھا۔

"آپ ادھر ٹھہریں گے صیب یا ڈاک بنگلے میں؟"

"ڈاک بنگلے!" ہم چھبیوں نے ایک ساتھ کہا۔

"کون سے بنگلے میں صیب؟"

"فارسٹ ریسٹ ہاؤس" عمّاد نے جواب دیا۔ "ہم نے اس کا بندوبست پنڈی ہی سے کر لیا تھا۔ ادھر تار دے دیا تھا۔"

"تار گھر تو خراب ہے جی"... شیر باز نے کہا... "ابھی ادھر تار نہیں آتا، چٹھی مٹی آتا ہے۔"

"بس تو چٹھی پہنچ گئی ہوگی" عمّاد نے اطمینان کے ساتھ کہا، کیونکہ یہ سارا انتظام اس کا تھا اور محکمہ جنگلات کے ایک بڑے افسر نے جو عمّاد کا دوست تھا اسے یقین دلا دیا تھا کہ ہمارے جانے تک سارے انتظامات مکمل ہوں گے اور چوکیدار کمرے کھول کر ہمارا منتظر ہوگا... مَیں نے انتظار کرنے والوں کو دیکھا۔ انتظار کرتے کرتے سو جانے والوں کو بھی اور مر جانے والوں کو بھی۔ مَیں نے مضطرب نگاہوں اور بے چین بدنوں کو دیکھا ہے۔ آہٹ پر لگے ہوئے کانوں کے زخموں کو دیکھا ہے۔ انتظار میں کانپتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا ہے۔ منتظر آدمی کے دو وجُود ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو جگہ مقررہ پر انتظار کرتا ہے۔ دُوسرا وہ جو جسدِ خاکی سے جُدا ہو کر پذیرائی کے لیے بہت دُور نکل جاتا ہے۔ جب انتظار کی گھڑیاں دنوں مہینوں اور سالوں پر پھیل جاتی ہیں تو کبھی بھی دُوسرا وجود واپس نہیں آتا اور انتظار کرنے والے کا وجود

اُس خالی ڈبے کی طرح رہ جاتا ہے جسے لوگ خُوبصُورت سمجھ کر سینت کے رکھ لیتے ہیں اور کبھی اپنے درمیان سے جُدا نہیں کرتے ۔ یہ خالی ڈبہ کئی بار بھرتا ہے ۔ قسم قسم کی چیزیں اپنے اندر سمیٹتا ہے، لیکن اس میں "وہ" لَوٹ کر نہیں آتا جو پذیرائی کے لیے آگے نکل گیا تھا ۔ ایسے لوگ بڑے مطمئن اور پُورے طور پر شانت ہو جاتے ہیں ۔ ان مطمئن، پُر سکون اور شانت لوگوں کی پرسنیلٹی میں بڑا چارم ہوتا ہے اور انہیں اپنی باقی ماندہ زندگی اسی چارم کے سہارے گزارنی پڑتی ہے ۔ یہی چارم آپ کو صُوفیا کی شخصیتوں میں نظر آئے گا ۔ یہی چارم عمر قیدیوں کے چہروں پر دکھائی دے گا ۔ اور اسی چارم کی جھلک آپ کو عمر رسیدہ پروفیسروں کی آنکھوں میں نظر آئے گی ۔

مَیں ایسے ہی ایک پرنس چارمنگ کو جانتا ہوں جسے بارہ برس تک اپنی محبوبہ کے خط کا انتظار رہا ۔ اس کی تحریر کی ایک جھلک دیکھنے کی آرزو تھی ۔ اس کے ہینڈ رائٹنگ کے خم و پیچ کو ایک بار پھر سے دیکھ لینے کی تمنّا رہی ۔

ہم ایک چائے خانے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے ۔ بیرے نے زرد پتّی کے پانچ پانوں والا لفافہ لاکر ہماری میز پر رکھ دیا ۔ ایک پان مَیں نے نکالا، دوسرا منیر نے ۔ پھر دو ہاتھ بیک وقت اس لفافے کی طرف بڑھے ۔ ایک منظور کا اور دُوسرا اُس چارمنگ پرسنیلٹی کا جس سے ہم اپنی اپنی جگہ بہت متاثر تھے ۔ انہوں نے مسکرا کر کہا :

"لیجیے لیجیے" اور پھر اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا ۔

منظور نے اپنا پان نکالا اور آہستہ آہستہ پُڑیا کھولنے لگا ۔ پرنس چارمنگ نے پانوں والا لفافہ اُٹھایا ۔ اُسے غور سے دیکھا اور پھر لفافہ میز پر رکھ دیا ۔ یہ لفافہ بی اے ہاؤس ٹیسٹ کے اس پرچے کا آدھا ورق تھا جو اُن کی محبوبہ نے دیا تھا اور جس کے ایک کونے پر سُرخ پنسل سے ۲۰ لکھا ہُوا تھا ۔ اس تحریر کی تلاش میں ان کا ایسٹرل وجود اتنی دُور نکل گیا تھا کہ اس کے واپس لَوٹنے کی ساری اُمیدیں ختم ہو چکی تھیں ۔ اُنھوں نے بڑی شائستگی سے مسکرا کر کہا :

"آج کی بارش تو کچھ لمبی ہی ہو گئی ۔"

ہم سب نے ریستوران کے دروازے کی طرف گردنیں موڑیں اور منظور نے خوش اخلاقی سے جواب دیا:

"جی سر! کچھ زیادہ ہی لمبی ہوگئی۔"

جب زندہ آدمی کا اندر مرجاتا ہے، تو وہ بڑا خوش اخلاق اور شائستہ ہوجاتا ہے اور شمعِ زندگی کے پروانے اس سے نور حاصل کرنے کے لیے دُور دُور سے اُڑ کر آنے لگتے ہیں۔

جب ہم ناران کے فارسٹ ریسٹ ہاؤس میں پہنچے تو وہاں کوئی بھی ہمارا منتظر نہ تھا۔ چوکیدار کو ڈھونڈا، تو پتہ چلا کہ وہ جمعہ پڑھنے گیا ہے۔ ہم نے اپنا سامان اتار کر برآمدے میں رکھا اور اخروٹ کے بھیگے ہوئے درختوں کا نظارہ کرنے لگے۔ مسعود، عمر اور عماد جمعہ پڑھنے چلے گئے اور مفتی، اعظمی اور میں سامان کی رکھوالی پر بیٹھ گئے۔ گلیشیئر کے ٹھنڈے پانی کی ایک کول اس ریسٹ ہاؤس کے گرد جھومر ڈال کر سامنے ترائی کی طرف بہہ رہی تھی۔ برآمدے کے کمرے پر سفید پینٹ ابھی اچھی طرح سوکھا نہ تھا۔ فرش سلا تھا اور ہم اپنے اپنے بستروں پر بیٹھے تھے۔

ناران پتھروں کا قصبہ ہے۔ سڑکوں پر پتھر، گلیوں میں پتھر، کھیتوں کی مینڈھوں پر پتھر، قبروں کے تعویذوں پر پتھر، کولوں کے کنارے پر پتھر، چھوٹے، بڑے، گول، چپٹے۔ پتھری پتھر۔ آپ راستوں پر اچھی طرح سے چل نہیں سکتے۔ کسی جگہ بیٹھ نہیں سکتے۔ قدم جما کر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ کسی سے محبت بھری گفتگو نہیں کر سکتے۔ شعر نہیں کہہ سکتے۔ گنگنا نہیں سکتے۔ حتیٰ کہ پتھر انہیں سکتے۔

میں سڑک کے بیچوں بیچ چھڑی کا سہارا لے کر کھڑا تھا اور میرا دایاں پاؤں ایک پتھر کے سر پر تھا۔ اس پتھر کی نُنڈ سیاہ اور چمکدار تھی اور دُھوپ کی تمازت سے اس پر پسینہ سا آیا ہُوا تھا۔ شدتِ جذبات سے اس پتھر کی رگیں پھیل سی گئی تھیں اور اس پر عجب کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ میں نے گھبرا کر اپنا پاؤں اس پر سے اُٹھایا اور ناف کے آگے چھڑی لٹا کر اس کے سامنے خمیدہ ہوگیا۔ کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو حمد کے ساتھ اللہ کی تسبیح نہ پڑھتی ہو۔ پتھر میں حیات یا رُوح

تو نہیں ہے، لیکن تمام مخلوقات خواہ بولنے والی ہوں یا خاموش، اپنے خالق کے بارے میں ضرور فصیح زبان سے کہے گی کہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جمادات کے دو پہلو ہیں۔ ایک رُخ اپنے خالق کی طرف جس میں وہ اللہ سے واقف، اللہ کے مطیع اور اُس کے عبادت گزار ہیں اور دوسرا رُخ مخلوق کی طرف۔ اس میں وہ نہ کچھ جانتے ہیں، نہ سنتے ہیں، نہ بولتے ہیں، مگر لوگ چونکہ جمادات کے ایک ہی رُخ سے واقف ہیں۔ اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ ہم بے حس پتھروں پر چل رہے ہیں اور بے جان زمین پر آجا رہے ہیں، اگر انہیں دوسرے رُخ کا علم ہوتا تو ناممکن تھا کہ کوئی شخص کبھی بھی خدا کی نافرمانی کرتا یا اس کی حکم عدولی کرتا۔

مجھے ٹھیک سے یاد نہیں، کوئی بزرگ تھے جنہیں فتح نصیب ہو چکی تھی اور وہ حضرت احمد یمنی کے مزار کے قریب زیتون کے درخت تلے بیٹھے تھے۔ اچانک دیکھتے کیا ہیں کہ سارے پتھر، کیا چھوٹے کیا بڑے اور سارے درخت اور اُن کی ٹہنیاں اپنی زبان میں خدائے بزرگ و برتر کی تسبیح پڑھ رہی ہیں۔ آپ لکھتے ہیں کہ اس تسبیح کے سننے سے قریب تھا کہ میں ڈر کر بھاگ جاؤں اور پھر کبھی اُدھر کا قصد نہ کروں کہ میں نے آنکھیں بند کر کے اپنے قریبی پتھر کی طرف غور سے کان لگائے، تو مجھے چند مختلف آوازیں سنائی دیں۔ مجھے تعجب ہوا کہ پتھر تو ایک مگر آوازیں کئی، یہ کیا معاملہ ہے؟ پھر میں نے آنکھیں کھول کر غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہ پتھر کئی پتھروں سے ترکیب پا کر ایک ہو گیا تھا اور ہر پتھر سے جُدا جُدا آواز آ رہی تھی۔ یہی لوگ کہتے ہیں کہ حیوانات کی دُنیا میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ جب ایک بیل کسی دُوسرے بیل سے ملتا ہے، تو دن بھر میں اُسے جو کچھ پیش آتا ہے وہ اس کا ذکر اپنے ملنے والے سے کرتا ہے کہ میں نے آج فلاں فلاں گھاس کھائی اور فلاں فلاں جگہ پانی پیا۔ فلاں فلاں جانور سے ملا اور فلاں فلاں خیال مجھے آیا۔ اسی طرح دوسرا بیل بھی اس کو جواب دیتا ہے اور دونوں اسی طرح باتیں کرتے رہتے ہیں جیسے ہماری گفتگو میں الفاظ اور مخرج اور معانی ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کی گفتگو میں حرف محذوف ہوتے ہیں یا یُوں سمجھیے ان کے حروف کو ہم سے مخفی کر دیا گیا ہے جیسے ایک کلر بلائنڈ کے لیے رنگ محذوف کر دیتے ہیں اور وہ ہر اُس شخص سے جھگڑتا رہتا ہے جس کو رنگ نظر آتے ہیں۔ ہم کو تو الفاظ نے اس قدر مجبور اور ایسا مشغل کر دیا ہے کہ جب تک کسی اجنبی کی زبان

نہ آتی ہو۔ ہم اُس کی خاموشی کا مطلب بھی نہیں سمجھ سکتے۔

سُورج کی چمک ایک دم غائب ہوگئی اور سارے ناران کو بادلوں نے گھیر لیا۔ ہلکی ہلکی بُوندیں پڑنے لگیں۔ ہم پتّھروں والی پگڈنڈی سے بھاگ کر پھر برآمدے میں آبیٹھے۔ سامنے دو کوہستانی عورتیں تیز تیز قدم اُٹھاتیں اپنی منزل کی طرف جا رہی تھیں۔ اعظمی نے چھڑی کی مُٹھ پہ سے ٹھوڑی اُٹھائے بغیر کہا:

"دیکھ! دیکھ مُفتی۔ سالیوں نے عمر بھر ناران سے بڑا کوئی اور قصبہ نہ دیکھا ہوگا، لیکن دیکھ چل کس طرح رہی ہیں، کولہے مٹکا مٹکا کر اور کمر گھما گھما کر۔"

مَیں نے بھی ان عورتوں کو للچائی ہوئی نظر سے دیکھا، تو مفتی نے کہا:

"یارو! تم تو بے حد نالائق آدمی ہو۔ اس میں شہری یا پینڈو ہونے کی کوئی بات نہیں فیشن یا سیکس کا کوئی جھگڑا نہیں۔ یہ تو قدرت کے کھیل ہیں۔ عورت اپنی چھوٹی ٹانگوں کی وجہ سے چھوٹے قدم اُٹھانے پر مجبُور ہے۔ عورت کی ران کی ہڈی ایک بڑے اور کُھلے پیڑو کے ساتھ جُڑی ہوتی ہے اور اندر کی طرف مُڑی ہوتی ہیں۔ ہڈی کے اس جوڑ کی وجہ سے اس کو ہر کُولہا ہر قدم پر باری باری گُھمانا پڑتا ہے تاکہ آسانی سے چل سکے۔ اگر عورت تم احمقوں کی طرح سیدھی طرح سے چلنے کی کوشش کرے تو اس کے گھٹنے آپس میں ہر قدم پر ٹکرانے لگیں اور وہ ہر مرتبہ مُنہ کے بَل گر جائے۔"

ہم دونوں کو یہ بات سُن کر بہت صدمہ ہُوا اور افسوس ہُوا کہ وہ ہمیں دکھانے کے لیے اس طرح سے نہیں چل رہی تھیں۔ پھر دُنیائے ادب کے وہ سارے ٹکڑے اور سارے شعر اپنی آب کھونے لگے جن میں کُولہے مٹکاتی عورتوں کا چسکے دار ذکر کیا گیا تھا۔

عُمر، عماد اور مسعُود جُمعہ پڑھ کر آگئے۔ اُن کے ساتھ ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار بھی تھا جسے انہوں نے مسجد سے اپنے ساتھ لیا تھا۔ چوکیدار بڑا سخت دل، اُصول پرست اور نمازی قسم کا انسان تھا۔ سارے راستے عمّاد اس کی منّتیں کرتا آیا تھا کہ ہمیں ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرنے کی اجازت دے دے۔ لیکن وہ کاغذ کے بغیر اور صاحب کی تحریری اجازت بنا کمرہ کھولنے پر رضامند نہ ہوتا تھا۔ ہم نے اپنا اپنا سامان کندھوں پر لادا اور چوکیدار سے مصافحہ کرنے کے بعد کسی اور

مسکن کی تلاش میں نکل کھڑے ہُوئے۔ کچھ مسکن دائمی ہوتے ہیں، کچھ عارضی۔ کچھ لوگ دائم ایک در پر پتھر کی طرح پڑے رہتے ہیں۔ کچھ لوگ بھری بس کے پیچھے اخبار کے ٹکڑے کی طرح بھاگتے ہیں۔ اور تھک کر کنارے سے لگ جاتے ہیں، پھر جب دیکھو بنتا ہے تو اور سمت کی طرف دوڑنے لگتے ہیں۔ دائمی لوگوں کے بدن بھاری، آنکھیں بڑی، کندھے چوڑے اور کولہے وزنی ہوتے ہیں۔ ان کے معدے عام طور پہ خراب اور ان کے بدن ریاح میں مبتلا ہوتے ہیں۔ یہ عام طور پر تھڑ دِلے، حاسد، جھوٹے، متکبر اور خود غرض ہوتے ہیں۔ عارضی لوگ چھریرے بدن کے ہوتے ہیں۔ ان کے چہرے سُتے ہوُئے، پیٹ تنگ، سینے کُشادہ اور ماتھے فراخ ہوتے ہیں۔ یہ جگر اور گُردے کی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ یہ بھی عام طور پہ خود غرض، متکبر، جھوٹے، حاسد اور تھڑ دِلے ہوتے ہیں۔ دائمی لوگوں کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ عمر بھر عارضی لوگوں کا رُوپ دھارنے کے پروگرام بناتے رہتے ہیں اور عارضی لوگوں کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ ہمیشہ دائمی لوگوں کی طرح زندگی گزارنے کے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔ عارضی لڑکیاں میک اَپ زیادہ پسند کرتی ہیں اور دائمی لڑکیاں زیور اور کپڑوں کو زیادہ پسند کرتی ہیں۔ ان دونوں کے درمیان سیز فائر کے باوجود جنگ ہمیشہ جاری رہتی ہے اور وہ اپنی اپنی حدیں پاٹ کر ایک دوسری پر شدید حملے کر جاتی ہیں۔ اس میں عام طور پہ بیشتر نقصان مردوں کا ہوتا ہے۔ عین اس طرح جس طرح نظریات کی جنگ میں ہمیشہ آدمی مارے جاتے ہیں ـــ نظریات نہیں۔

ہم اپنی اپنی پُشتوں پر اپنا اپنا بوجھ لادے ایک عارضی مسکن کی تلاش میں نارہان کے بازار سے گزر رہے تھے۔ اور دکاندار، قلی، کسان، موچی، ترکھان، مولوی اور چرواہے ہمیں اپنی اپنی نگاہوں کے ترازو میں تول رہے تھے۔ بازار میں ایک طرف آٹے دال، کھل بنولے، گھڑی ساز، فلیٹ بُوٹ، چپلی کباب، چائے اور گھڑی ساز کی دُکانیں تھیں اور دوسری جانب چپلی کباب، صابن، خشک میوے، گھڑی ساز، بساطی، جیپ ٹائر، جیپ بیٹری، جیپ ترپال، نائی اور گھڑی ساز کی دُکانیں تھیں۔ ان دکانوں کے باہر کچھ لڑکے سبز اخروٹ اور ملوک بیچ رہے تھے اور ہر چار دکانوں کے بعد سڑک کے کنارے ایک موچی بیٹھا تھا۔ دیواروں پر مرزائیوں کے